بدمزگی مول نہ لیں۔

ڈیڈی جی دل کے نرم' انسان دوست اور کامریڈ قسم کے شخص تھے۔ جب باباجی کی وفات کے بعد کچھ عر لیے اُنہوں نے فیسرین کا کام بھی سنبھالا۔ یہاں اُن کا دفتر اُن سیڑھیوں کے ساتھ تھا جو اوپر شفقو جی کے چوبارے تھیں۔ یہاں اس دفتر میں اُن کی آدرشی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ اُن کے پاس آنے لگے اور اُن میں لیڈر شپ کی اُبھرنے لگیں۔ شاید لیڈر شپ کی خوبی جس کی وجہ سے وہ بعد میں میری اور خاں صاحب کی شادی میں کود پڑے شادی کی پاداش میں انہیں 1-مزنگ روڈ سے باباجی نے نکال دیا تھا، لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی 60-

[illegible]

ابھی تو میں آپ کو اُن لوگوں سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہی ہوں جو سکول میں ہماری بے سر باوجود ہم سے جڑے رہے۔ ککھو ڈیڈی اور تقو کے بعد ناہید میرے پاس سکول آنے لگی۔ ناہید خاں صاحب آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب احمد خاں کی بیٹی ہے (اور ڈاکٹر ایوب خاں ماڈل ٹاؤن میں 36-جی میں رہتے فرخندہ کو تم اور اماں جی سردار بیگم کو اپنی والدہ زیادہ سمجھتی تھی۔

جن دنوں شفقو جی مزنگ روڈ میں رہا کرتے تھے اور ناہید اپنے گھر ماڈل ٹاؤن میں رہنے کے بجائے میں مقیم تھی تو خاں صاحب نے ناہید کو پڑھانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ ناہید پیدائشی آرٹسٹ تھی۔ وہ ا تصویروں میں رنگ بھرنے میں مشغول رہتی تھی۔ ابھی اُس کا یہ جوہر آشکار نہ ہوا تھا لیکن ایک ست الوجود آرٹسٹ اُسے کبھی اس فکر نے نہ ستایا کہ اُس کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے محنت، کوشش، جدوجہد کے ساتھ کسی منزل کے لیے ہوگا۔

جب 1950ء میں ابھی خاں صاحب روم نہ سدھارے تھے، ناہید بڑی سعادت مندی کے ساتھ دوپٹے سے ڈھانپ کتابیں ہاتھ میں لے کر اندر والی سیڑھیوں سے چڑھ کر خاں صاحب کے پاس اوپر چوبا پہنچتی۔ خاں صاحب اُسے پڑھاتے۔ وہ نہ کبھی کوئی چیز نوٹ کرتی نہ دوہراتی۔ دوسرے دن خاں صاحب پوچھتے۔ جو سوالات میں نے تمہیں حل کرنے کے لیے دیے تھے، وہ ہوم ورک کر لیا؟"

ناہید کی خوبصورت براؤن آنکھیں تحیر سے بھر جاتیں۔ "کون سے سوالات شفقو بھائی؟"

"اچھا وہ مضمون پڑھ لیے جن پر میں نے نشان لگا کر دیا تھا؟"

وہ مظلوم بن کر نظریں جھکا لیتی اور مری سی آواز میں کہتی۔ "کون سے نشان شفقو بھائی؟"

خاں صاحب اپنی تمام تر قوت برداشت کے باوجود چڑ جاتے۔ "سارا دن کیا کرتی رہتی ہے بریتی؟ ہے اپنے وقت کا؟ کس طرح اپنا سونا پیتل کرتی ہے؟"

ان جھڑکیوں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ معصومیت سے سوال کرتی۔ "شفقو بھائی ابریتی کیا ہوتی ہے؟" پنسل سے اپنے بالوں کو کریدتے ہوئے شفقو جی کہتے "خشکی کا وہ ریتلا ٹکڑا جو دریا کے بیچ بھیگنے سے ہے۔ پانی اُس کے دائیں بائیں سے گزرتا ہے لیکن وہ بریتی خشک رہتی ہے۔ تیرے اردگرد علم کا دریا بہہ رہا ہے غافل

گی یہ وقت واپس نہیں آئے گا اور کچھ نہیں تو پینٹنگ میں ہی نام پیدا کر۔ کوئی سمت کوئی شوق کوئی جہت تو ایسی پیدا کر تو اپنی زندگی کو با مقصد بنائے۔ تیری کوئی اپنی شناخت ہو۔"

یہ کلمہ شفقو جی نے کئی بار دہرایا لیکن اس اُکسانے سے ناہید نے نہ کبھی کچھ سیکھا نہ برا ہی منایا۔ روم جانے سے پہلے خان صاحب نے مجھ سے کہا۔

"قدسیہ میرا ایک کام کر دو گی؟"

"جی۔"

"ناہید کو تم جانتی ہو۔ اُسے ذرا بی اے کرا دو۔ وہ شہد سے میٹھی اور سمندر سے گہری ہے لیکن میرے قابو میں بریتی نہیں۔"

"جی میں کچھ باقاعدہ استاد نہیں ہوں۔ میری کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔"

"استاد ہونا ضروری نہیں، تم میں صبر زیادہ ہے۔"

بغیر سوچے سمجھے ہمیشہ کی طرح میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔

لیکن اس وعدے کو ایفا کرنے کا وقت 60-فیروز پور روڈ میں ایفا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پڑھانے میں دقت بھی ہوگی۔ پڑھانے سے پہلے میں رتی بھر خوفزدہ نہیں تھی کیونکہ میرے آئی کیو میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ میں کوئی بھی فکر کیے بغیر کر لیتی ہوں۔ پھر اس Impulsive فیصلے کو توڑ نبھانے کے لیے صدقِ دل سے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگاتی ہوں۔ عام طور پر اللہ میاں میری لاج رکھ لیتا ہے اور میرے عیوب کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے۔ اسی ستر پوشی کے طفیل کمزوریوں کا بھید معاشرے میں کھلنے نہیں دیتا اور میری محنت، لگن کو ترقی، کامیابی اور عزت میں بدل کر میری محنت کو لوٹا دیتا ہے۔

اس سکول میں میرے پاس ناہید کے آنے کی وجہ اس کا بی اے کا درپیش مرحلہ تھا۔

تقو کی طرح ناہید بھی عموماً شام کو ہی سکول پہنچتی۔ ہم دونوں یا ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں یا پھر دسویں جماعت کی کلاس میں بیٹھ کر پڑھتے۔ اگر اُسے کھانے کی طلب ہوتی تو وہ یہیں بیٹھ کر دال دلیہ کھا لیتی۔ ناہید کبھی بھی خوش خوراک نہیں تھی۔ اس زمانے میں ابھی ریستورانوں کی بھرمار نہ ہونے کی وجہ سے ہماری ساری پود گھر کے سادہ کھانے خوشی سے کھا لیتے۔ کمرے میں چاک کی خوشبو کسی ڈیسک پر ربڑ پنسل پڑی نظر آ جاتی۔ ڈائننگ روم تو کیا' مناسب میز بھی نہ ملتا۔

ناہید تو ازلی بریتی تھی لیکن مجھے اسے پڑھانے، اُکسانے اور محنت پر راغب کرنے کا طریقہ نہ آیا۔ وہ نہ تو کبھی ٹیسٹ نہ نوٹس بناتی نہ کبھی کسی جواب کو دوہرانے کی کوشش کرتی لیکن لڑکی بنیادی طور پر ذہین تھی۔ میں کورس کی کتابوں سے پڑھے جاتی تو وہ بے توجہی سے سنے جاتی۔ جیسے کیسے امتحان کا وقت آ گیا۔

کنیرڈ کالج اس کا سینٹر بنا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت پر امتحان دینے آ جاتی۔ اکیڈیمک کمروں میں امتحان گاہ میں پہنچ جاتی۔ مجھے ہر لحظ خوف رہتا کہ کہیں وہ پرچہ نہ چھوڑ دے یا ماڈل ٹاؤن سے آنا ہی نہ بھول جائے۔ ریزی مجھے وقت سے بہت پہلے کالج کی لان میں چھوڑ جاتا۔ جب ناہید امتحانی گتا، جیومیٹری بکس، پن، فتا لے کر مجھ تک پہنچتی تو میں

شکر کا سانس لیتی۔

''پرچہ کیسا ہوا؟''

''اچھا ہوا ہے قدسیہ آپا۔''

میں امتحانی پرچہ غور سے دیکھتی۔

''اور اس سوال پر نشان نہیں لگایا، یہ چھوڑ دیا؟''

''بس ٹائم نہیں ملا قدسیہ آپا۔''

میں اس خیال سے کہ کہیں اگلے پرچے نہ چھوڑ دے، چپ رہتی لیکن میری حیرانی کی حد نہ رہی جب صاحب کی لاڈلی چھوٹی بہن (یا بھانجی) نے رزلٹ آنے پر سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

ان ہی دنوں میں جب ہم سکول میں منتقل ہوئے تو آپا فرحت نے سمن آباد میں گھر خرید لیا اور وہ بھی ہولے میرے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگیں لیکن ان کی کتابیں دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں ثقیل کتابیں کبھی پڑھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ پھر بھی میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی۔ وہ بھی بغیر جے کیے آتی جاتی رہیں لیکن ذہین آپا فرحت نے سمجھ لیا کہ یہ پڑھائی نہ استاد کے بس کی ہے نہ شاگرد اس سے کچھ حاصل ہے۔ رفتہ رفتہ ناغے پڑنے لگے۔ وہ تو کس بننا چاہتی تھیں۔ سوال کرنے کی خواہش مند تھیں۔ یہ سب کچھ میرے نہ تھا اور بالآخر آپا جی نے سکول آنا چھوڑ دیا۔

خاں صاحب کو جب یہ اطلاع ملی انہوں نے کسی خط میں مجھ سے برملا نہ پوچھا کہ ایسی کوتاہی کی وجہ آپا جی کیوں پڑھنا چھوڑ گئیں۔ خاں صاحب مجھے بغیر کسی سوال جواب کے خط لکھتے رہے۔ حالات کچھ امید افزا نہ لیکن میرے اندر امید کا چھوٹا سا دیا جلتا رہا۔ غالباً اس دیے کا تیل وہ خط اور کارڈ تھے جو مجھے روم سے ملتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا وعدہ شادی کے لیے کوئی التجا وغیرہ کبھی رقم نہیں ہوئی لیکن اپنائیت سے لکھے گئے ان خطوں میں اچھے پیش آئے تجربات، مغربی لوگوں سے ملنے کے بعد تاثرات اور ثقافتی تقابل کی خوبصورت تفصیل ہوتی تھیں۔

میرے سکول میں رہنے کے باعث اپنی ٹیچرز سے دوستی ہو گئی جو نہ جانے کیوں میری طرف ملتفت تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کی بھانجی تھی اور میرے کندھے پر بھی ایک اضافی بلا لگا تھا۔ ان دوستوں میں سے قابل ذکر محمودہ اصغر تھی۔ وہ 30-جیل روڈ پر رہتی تھی اور مورس کار میں سکول آیا کرتی۔ مجھے اس کا یہ دبدبہ اور شپا'' دل سے بھاتا۔ اس کا دنیاوی Status سکول والی مڈل کلاس استانیوں اور شاگردوں سمیت زیادہ تھا۔

محمودہ کے والد انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان سے کچھ تو میری دوستی کی وجہ سے اور کچھ خالہ کی مرعوبیت کے باعث تعلقات بڑھ گئے۔ اصغر صاحب بھی ہر بڑے آدمی کی طرح اندر سے تنہائی کا شکار تھے۔ بیگم ایک سیدھی سادی خاتون خانہ تھیں لیکن ان میں ایک خوبی اچھی خانہ داری کے علاوہ بھی تھی۔ وہ ڈھولک بہت عمدہ بجاتی تھیں۔

ہم ان کے گھر جاتے تو میری خالہ اصغر صاحب کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتیں۔ تاش اور

...زنی اِن ڈور کھیل تھے۔ محمودہ کی والدہ ہر بڑے آدمی کی بیوی کی طرح Left out محسوس کرتیں تو وہ میرے ساتھ ...بجانے میں مشغول ہو جاتیں۔ میں روڑا یا چھوٹی چمچ بجاتی۔ پھر ہم دونوں مل کر شادی بیاہ کے گیت اور ادھر ...کیے فوک گیت گاتے۔ محمودہ تو تاش کھیلتی نہ کبھی ہمارے ساتھ سنگت ہی کرتی۔ اس کا وقت کبھی میز سجانے یا ...درست کرنے میں لگتا۔ محمودہ اصغر کے گھر لذیذ کھانے ہمیشہ ہمارا سواگت کرتے۔

محمودہ اصغر کی دو اور شناختیں بھی تھیں۔ اس کی شادی اظہر صاحب سے ہوئی جو پاکستانی حکومت کے پہلے ...ایڈوائزر رہے۔ کسی سفارش کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس زمانے میں Economic Wizard تھے اور ...دنیا کی معیشت پر اُن کی گہری نظر تھی۔ دوسری پہچان محمودہ کی اس کی چھوٹی بہن مشہور و معروف ادیبہ خالدہ حسین ...سکول کے دور میں خالدہ بہت چھوٹی تھی۔ وہ ہم دونوں کی دوستی کو منہ میں انگلی ڈال کر دیکھنے کی عمر میں تھی۔

مجھے دوپہر کو سونے کی عادت ہمیشہ سے ہے۔ جب کبھی میں محمودہ کے گھر دوپہر کو ہوتی تو خالدہ بھی میرے اور ...کے ساتھ تکیہ جوڑ کر لیٹتی۔ خالدہ اُس زمانے میں پڑھنے کی رسیا تھی۔ یہی شوق آگے چل کر خود اُسے لکھنے کی شکل میں ...اس شوق کے علاوہ اسے لڈی، بھنگڑا اور کچھ کچھ کلاسیکی ناچ کی طرف بھی رغبت تھی۔

محمودہ اظہر کے علاوہ میری پرانی دوست نسرین رشید اور شمیم رشید بھی آ جاتیں۔ ان دونوں لڑکیوں سے میری ...ایک آدھ بار ملتان میں بھی ہوئی تھی۔ وہاں اُن کے والد رشید صاحب ملتان میں اُن دنوں ڈپٹی کمشنر تھے اور اُن کی ...سے ناتا کے مراسم کافی جاندار تھے۔ ابھی نسرین بی اے کرنے کے مرحلے میں تھی۔

ناہید کی پڑھائی کا مرحلہ ختم ہوا تو ناہید آپا فرحت کے پاس سمن آباد میں منتقل ہو گئی۔ پھیرا فوراً قائم رہا۔ میری ...ناہید کو جھونگے (بونگی) میں مل گئیں۔ ایک روز ہم سہیلیوں نے ناہید کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ پیدل نالے کے ساتھ ...روانہ ہوا۔ اتفاقاً پیچھے سے ایک ریڑھے والا نظر آیا۔ ہم نے اُس کا راستہ روک کر ٹھہرایا۔ شریف آدمی نے بلا چون ...ریڑھا روک لیا۔ سب اس میں سوار ہو گئیں اور سمن آباد کا رخ کیا۔ چندہ کر کے پیسے اکٹھے کیے جو غالباً اُجرت سے کم ...شریف آدمی نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ ہمیں بغیر کوئی مذاق یا جھگڑا کیے سمن آباد آپا جی فرحت کے گھر اُتار دیا۔

ہم آج کی نوجوان نسل پر آزاد روی کا لیبل لگاتے ہیں لیکن ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ ہر بیس پچیس سال ...بعد آزادی کا معیار بدل جاتا ہے۔ یہی ارتقاء کا راستہ ہے۔ ہمیں پسند آئے نہ آئے اللہ اسی طرح تبدیلی لاتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں بھی فاسٹ فوڈ تھا۔ گول گپے، دہی بھلے، چکڑ چھولے، پکوڑے ہماری پود کے پسندیدہ تھے اور ماں ...چسکوں سے منع کرتے تھے جیسے آج برگر، چپس اور سوفٹ ڈرنک سے منع کرتے ہیں۔ تب فون نہ تھے غائبانہ گفتگو ...پر ہو سکتی تھی نہ فون پر لیکن خطوں کے کبوتر اور چوری چھپے کی ملاقاتیں عام تھیں۔ ایک موت ایسی اٹل حقیقت ہے جسے ...آنکھوں سے دیکھتا اور جھٹلا نہیں سکتا۔ باقی سب کچھ اس کی بصیرت اور آئی کیو اور جینز پر منحصر ہے۔ وہ کیا کچھ سمجھ ...کس چیز سے کیا سیکھتا ہے؟

میں نے اسی سکول میں اپنا ایک ناول قریب قریب مکمل کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد کے واقعات اور نشیب و ...میں نہ ہو سکے اور نیت کی تقسیم پر یہ ناول تا حال نامکمل ہے۔ اپنے پڑھنے پڑھانے کے شغل میں مجھے پانچویں جماعت

میں انارکلی ڈرامے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں چھوٹی عمر سے انارکلی کے کردار میں ڈھل جانے کی خواہش رکھتی اس خواب نے ابھر کر مجھے ستانا شروع کیا۔

میں نے سید امتیاز علی تاج کے اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کی ٹھان لی۔ پیچھے میری نیت یہ تھی کہ میں ادا کروں گی۔ محمودہ اظہر شہزادہ سلیم کا کردار تیار کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو بلایا اور استدعا کی کہ وہ دلآرام کا رول لیکن وہ بیچاری روایت پسند بدک گئی کیونکہ میں یہ ڈرامہ آرٹس کونسل میں کرنا چاہتی تھی۔ خیر سکول کی ایک ٹیچر بلقیس دے دیا گیا۔ اکبر کے رول کے لیے تھوڑی سی مشکل درپیش تھی لیکن پھر نسرین نے یہ ذمہ داری اٹھائی۔

نسرین نے بادشاہ اکبر کا رول اپنایا۔ چونکہ قد ذرا چھوٹا تھا اس لیے ہیل والی جوتیاں پہن کر اُوپر سے زیب تن کر کے سٹیج پر براجمان ہوتی۔ اس زمانے میں نسبت روڈ پر ایک ''ہالی وڈ ٹیلرز'' ہوا کرتے تھے۔ فلموں کے لباسوں کا سٹاک رکھتے تھے۔ پیسے جمع کر کے ان سے ساری کاسٹ کے ملبوسات جمع کیے۔ ناہید کو ڈرامے میں لیکن وہ سکول میں ہونے والی ریہرسلوں پر آ جاتی اور بڑے مزے کا وقت گزرتا۔

ہال کے لیے آرٹس کونسل کی طرف رجوع کیا۔ نئی بلڈنگ میں ایک لمبوترا سا سٹوڈیو دائیں طرف جس پر سٹیج شو اور ڈرامے کبھی کبھی منعقد کیے جاتے۔ میں وہاں پہنچی، یہیں میری پہلی ملاقات انور سجاد سے ہوئی۔ کی طرح اُس میں قدرتی تجسس تھا۔

''آپ؟''

''میرا نام قدسیہ چٹھہ ہے اور میں یہاں انارکلی ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن یہ تو بہت Elaborate مغلیہ ماحول کا ڈرامہ ہے۔ آپ کیسے......؟''

''ہم کرلیں گے۔ آپ تاریخیں دے دیجیے۔''

''وہ تو میں دے ہی دوں گا لیکن کیا آپ کو ایسا کوئی تجربہ پہلے بھی ہے؟''

''جی نہیں تجربہ تو نہیں ہے لیکن کرلیں گے...... تجربہ۔''

''سلیم کا رول کون کرے گا؟'' انہوں نے چند فلمی ایکٹروں کے نام مدد کے لیے پیش کیے۔

''جی نہیں اس میں مرد کاسٹ شامل نہیں ہے۔ ہم لڑکیاں ہی سارا کام کریں گی۔''

انور سجاد نے ابرو اٹھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ چاپ تاریخیں دے دیں۔

اس ڈرامے کے دوران دو عجیب واقعات ہوئے۔ ناہید اپنے ساتھ اماں جی سردار بیگم کو لے کر ڈرامہ د آ گئیں۔ سٹیج کی لائٹیں اور مغلیہ سیٹ میرے بھائی ریزی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ واقعی سٹیج دیکھ کر لگتا تھا کہ مغلیہ دربار حصہ روشن ہو گیا۔ جب وہ سین آیا جب شہزادہ سلیم سے لپٹ کر انارکلی اپنے کنیز ہونے پر روتی ہے اور شہزادے کو اپنی خو سے باز رکھنا چاہتی ہے تو میں نے سٹیج پر وارفتگی کے عالم میں اتنے آنسو بہائے اور یوں محمودہ سے لپٹی کہ اس عشق و عا اماں جی جو پرانی وضع کی خاتون تھیں، برداشت نہ کرسکیں اور غصے سے اُٹھ کر باہر نکل گئیں۔ ناہید کو بھی بادلِ نخواستہ سات کر جانا پڑا۔

واقعے کا میں نے کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ اس وقت ڈرامہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔

ورا واقعہ اس سے بڑی حیرت کا موجب ہوا۔ اس ڈرامے کی سکول میں خوب ٹکٹیں بکی تھیں۔ لڑکیوں نے ‌وں سے پیسے وصول کیے تھے اور ہماری خزانچی محمودہ نے بڑی رقم جمع کر لی تھی۔ جس وقت ہم سب اپنا سامان ‌ے جانے کو تھے تو ایک بار پھر انور سجاد وارد ہو گئے۔

"آپ کا ڈرامہ تو بہت کامیاب گیا۔"

"ہاں جی۔"

"ایک بات ہے قدسیہ۔ میرے پاس ایک فلم کے ڈائریکٹر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے

"فلم ڈائریکٹر؟"

"وہ آپ کو اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے؟...... پر انہیں کیسے پتہ چلا؟"

"یہ فلمی لوگ ٹیلنٹ ہنٹ کرتے رہتے ہیں بانو صاحبہ۔ کسی سراغ رساں نے انہیں خبر دی ہوگی۔ آپ کرنا ‌ے آفس میں چل کر اُن سے مل لیں۔"

"نہیں سجاد صاحب! مجھے ایسی اجازت گھر سے نہیں ملے گی۔ اُن سے ملنے کا فائدہ۔"

میں انور سجاد کو انکار کر کے واپس لوٹی تو میرے دل میں عجیب قسم کا ملال تھا۔ شاید اس روز میرے Career کا ‌آپ ہو گیا۔ اگر اس روز میں فلموں میں چلی جاتی تو شاید ادیب بننا میرے مقدر سے غائب کر دیا جاتا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کے ہر دوراہے پر انسان کو اپنا فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اللہ میاں بھی انسان کی اس ‌ی میں حائل نہیں ہوتا۔ اُس نے تضاد سے انسانی لہو کی تشکیل کی ہے۔ یہاں صاف اور گندے لہو آپس میں گڈمڈ ‌حکم اللہ کبھی نہیں دیتا۔ یہ ہر انسان کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے کہ وہ کسی دوراہے پر پہنچ کر کونسی تضاد کی راہ اختیار کرے گا۔ ‌ے میں اُس کے سفر کی چال، کامیابی اور ناکامی کا لیول مضمر ہے۔

ناہید نے جب اماں جی کے ساتھ چلے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس نے ماننے والوں سعادت مند لوگوں میں اپنا نام ‌۔ وہ دل سے ہم جیسی ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ تھی لیکن اس اندرونی سوچ کے باوجود اس کا عمل مثبت اور راسخ تھا۔ ‌کوئی کام نہ کرنا چاہتی تھی جس سے ان کے بزرگوں کے دل دُکھیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس فیصلے پر پہنچی کہ شاید مجھے ‌خود مختاری اور خود ساختہ آزادی کو خدا حافظ کہہ کر ہی اشفاق صاحب کے گھر میں داخلے کی ٹکٹ مل سکتی ہے۔ میں اس ‌ے گروہ کی خود معین کردہ لیڈر تھی۔ ریزی غریب سارا دن غائب رہنے کے باعث اور بیکار ہونے کے ہاتھوں غریب ‌کی طرح کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ والدہ ملتان میں تھیں۔ خالہ ویسے ہی احسان جتا کر اب اپنا کیا دھرا ضائع ‌کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے کبھی روک ٹوک کا سہارا نہیں لیا۔ اِدھر اس ساری خودسری کو ناہید کی طرح تج کر ‌مجھے کچھ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ اُدھر اُن خطوں نے امید کا دیا روشن کر رکھا تھا۔

جب خاں صاحب روم سے لوٹے تو میں 455-این میں مقیم تھی۔ میری ٹیپیاں سُنیں تو منہ سے نہ
نہ کہا۔ صرف آہستہ سے بولے۔ ''اچھا وہ فارسی غزل جو تم نے گائی تھی ذرا وہ تو سناؤ۔'' میں نے گائے بغیر فارسی
پڑھ دیا۔ انہوں نے اپنا سر انگلی سے کھجلاتے ہوئے کہا ''قدسیہ! کسی سے تلفظ ٹھیک کروا لینا تھا۔ تمہیں معلوم
سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ ''روکو مت جانے دو'' کے اور معنی ہیں اور ''روکو! مت جانے دو......'' کے کچھ اور معنی
وقفے سے سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔'' کچھ انور سجاد کا واقعہ مجھے سرد کر گیا تھا لیکن اس کے بعد میرا Career بیچ
رک گیا۔ میں ایک عرصے سے ایکٹریس بننے کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق واجبی سا
راستے پر بورڈ لگ گیا۔ ''روکو! مت جانے دو۔''

آہستہ آہستہ خاں صاحب نے ہی میرے اس ثانوی شوق کی پرورش کی اور اب مجھے محسوس ہوتا ہے
اللہ نے ہی میرے دل میں یہ فیصلہ صادر کر دیا ورنہ اس دوسرے راستے پر چل کر مجھے کچھ زیادہ ہی ناکامی کا سا

اب میں برسوں کے لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرے لکھنے اور خاں صاحب کے لکھنے
آسمان کا فرق تھا۔ وہ Conviction کے آدمی تھے۔ انہوں نے جب بھی قلم اٹھایا اُن کی تحریر میں یہ ion
صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

میں لکھتی ضرور ہوں لیکن میرے لیے یہ شغل ہمیشہ دوئم درجے کی Activity رہا۔
میں نے کبھی اسے اولیں جگہ نہیں دی۔ جس طرح خاں صاحب اور کچھ اور میرے واقف کار ادیب
پر ترجیح دے کر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ جو کچھ مجھے ایم اے کی تعلیم میں نصیب ہو گیا میرے لیے کافی تھا۔
کچھ پڑھتی تھی کسی افادیت کے پیشِ نظر مطالعہ نہ تھا۔

60-فیروز پور روڈ سے میری خالہ فیروزہ 450-این میں منتقل ہو گئیں۔
میں اور ریزی اُن کے دم چھلے بھی ساتھ گئے۔ یہاں خاں صاحب کے خطوں نے ڈھارس بندھائی
کی پوسٹنگ اُن دنوں کھاریاں میں تھی۔ وہ جب بھی آتا ہمارے پاس ضرور آتا۔ رات کو ریزی کا پاجامہ پکڑ
کے گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے تک آتا تھا۔

سمن آباد کے اس کوارٹر کی ساخت ایسی تھی کہ اس کا فرنٹ سامنے والی سڑک پر اور ایک چھوٹی سی
مارکیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر بنی تھی۔ میں اور تقو دیر تک اسی چھوٹی دیوار پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ اس
الفاظ میں اپنی محبت یا وفاداری کا اظہار نہ کیا لیکن کوئی ایسی Frequency ضرور تھی جو اس کا جذبہ مجھ تک پہنچاتا رہا۔
علاوہ کالی ماں سے ملنے افتخار بھائی آیا کرتے تھے۔ اب ناہید بھی قریب تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے آتی رہتی۔

لیکن پھر ایک بار تبدیلی کا حکم ہوا اور میری والدہ نے ہمیں 455-این کا کوارٹر کرائے پر لے دیا۔ اب
پھر ریزی اور میں مختارِ کُل تھے۔ ہم دونوں آزادی سے اپنے فیصلے سے راستے کا چناؤ کرتے۔ ہم کو اپنا وقت کیسے گزا
کیونکر گزارنا ہے، اس کے لیے ہم کسی کے جوابدہ نہ تھے۔

455-این سمن آباد

اچانک استاد صاحب نے آنا چھوڑ دیا۔ یا تو وہ جس قدر جانتے تھے اُسے Deliver کر چکے تھے یا انہیں علم تا کہ میں اس سے زیادہ علم موسیقی حاصل کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس مشغلے سے فراغت پا کر میں نے ہاتھ دھونے میں وقت ضائع نہ کیا۔ اب کچھ زیادہ وقت میں خالہ کے پاس جاتی یا اپنے ناول کو سیدھا کرنے میں بھی صاحب کو روم سے آئے چند دن ہوئے تھے کہ میں نے ایک دن اُن کو مرعوب کرنے کی غرض سے شیخیاں مارنا کر دیں کہ کس طرح ہم نے ڈرامہ کیا اور میں نے اس کا سکرپٹ لکھا۔ پھر کیسے سٹیج پر میں نے ''اک ترک غمزہ زن کہ ستی'' گانا گایا۔

چند لمحے خاں صاحب خاموش رہے پھر بولے ''ذرا مجھے گا کے تو سناؤ۔''

میں نے بڑے تکبر سے پہلا مصرعہ لگایا۔

وہ کچھ لمحے سوچ کر پھر بولے ''سنو کاکی! اس مصرعہ میں تو غلطیاں ہیں۔ پھر ویسے بھی تمہاری آواز کانپتی ہے۔ وہ تمہیں نہیں آ سکتا۔ ہو سکے تو کوئی اور مثبت کام کرو۔''

پھر خاں صاحب روم سے لوٹ آئے۔ ایک دو دن غالباً گھر والوں سے میل ملاقات میں گزرا۔ تیسرے دن کے وقت خاں صاحب ہمارے گھر آئے۔ یہاں برآمدہ گزر کر ایک لمبا کمرہ تھا جس میں ہم نے اپنی طرز کا ڈرائنگ کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اسی گول میز کے گرد چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر بیٹھ کر میں ناول لکھتی۔ ریزی صاحب اپنی یں تحقیق کرتے اور ہم مل کر ناشتہ اور کھانا بھی کھاتے۔

خاں صاحب کو آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ ہم اسی گول میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک باجی ضیا یں۔ چند لمحے علیک سلیک کے بعد انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ''چلو اٹھو شفقو! جہلم سے سعید بھائی آئے ہیں۔ اس فیکٹری کے مالک۔''

سعادت مند بھائی کی طرح خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے نہ الوداعی سلام کیا نہ پھر آنے کا وعدہ کیا اور

خاموشی سے باجی ضیا کے ساتھ چلے گئے۔

منزہ اور میں اُن دنوں اکٹھے ہوتے تو ہم سڑکیں ناپنے کے لیے چل نکلتے۔ ابھی منزہ اشتیاق کی بیوی نہ
ہم دونوں میں ایک سی خواہش کہیں ہر وقت شور مچایا کرتی۔ اُس شام ہم دونوں نے 30۔جیل روڈ محمودہ اصغر کے گھر
ارادہ کیا۔ بس ارادہ کرنے کی دیر تھی، ہم چل نکلیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر گاڑیوں کا رش نہ تھا۔ لڑکیوں کو اغوا کرنے کی
نہ پڑی تھی۔ جیل روڈ پر پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ”منو...... کا کی۔“ میں بے پرواہی سے چلتی رہی۔
ہوئی...... ”کا کی...... کا کی رُکنا......“

منزہ نے مجھے روکا۔

پیچھے ککھو ڈیڈی چلے آ رہے تھے۔

ہم دونوں نے سلام کیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”جی یہاں 30۔جیل روڈ پر میری کیلی محمودہ رہتی ہے۔ اس سے ملنے جا رہی ہیں۔“

”کیا امی ملتان سے آ گئی ہیں؟“

”جی کل رات ہی پہنچی ہیں۔“

مجھے ہلکا سا شک بھی نہ گزرا کہ ککھو بھائی اتنا بڑا اسندیسہ لے کر آ ئیں گے۔ دوسرے دن میں خالہ
ہوئی تھی تو ڈیڈی جی آئے۔ انہوں نے امی سے کہا...... ”امی جی! مجھ سے اب شتو کا یہ سنتاپ دیکھا نہیں جاتا۔
بچہ نہیں ہے۔ پھر اسلام میں ایسی پابندی کہاں ہے؟ آپ کل تیار رہیں۔ کل میں شام کو عصر اور مغرب کے
آؤں گا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف سے دو گواہ مقرر کر لیے ہیں۔ محمد حسین آرٹسٹ اور قدیر ملک۔ مولوی
ساتھ ہوں گے۔“

امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

امی نے ذرا جرأت سے کہا...... ”ککھو بیٹا! ایسی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو؟“

”آپ کی مجبوری نہیں، میرے بھائی کی مجبوری ہے۔“

”اچھا پھر تمہاری مرضی۔“

ڈیڈی نے ذرا ہچکچا کر کہا...... ”ایک بات ہے امی۔“

”ہاں، وہ کیا؟“

”میری کالی ماں اور گڈو کو پتہ نہ چلے۔ ابھی 1۔مزنگ روڈ کی فضا ٹھیک نہیں۔ اماں جی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔“

”لیکن وہ تو ساتھ ہی رہتی ہیں۔“

”یہ آپ جانیں اور آپ کا کام...... منزہ کو بھی پتہ نہ لگے۔“

میں اپنے آپ کو ایک جاسوسی ناول کی ہیروئن سمجھ رہی تھی۔ اس سارے Adventure میں مجھے لطف

... پہننے کے لیے نہ کوئی خوبصورت جوڑا تھا نہ کوئی زیور ہی۔ ہاں میں نے اتنی تیاری ضرور کی کہ ایک چوڑیاں ... کی سرخ چوڑیاں خرید کر پہن لیں۔

... دسمبر 1956ء کی یہ شام بڑی خاموشی لے کر آئی۔ محمودہ اصغر واقعے سے کچھ پہلے آ گئی۔ میرے پاس ایک ... سفید دوپٹہ اور شلوار تھی۔ صرف قمیض تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی لیکن اسے سینے کا وقت بھی نہ تھا۔

"تم مجھے بتا دیتیں۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا جوڑا لے آتی۔"

"بس ٹھیک ہے محمودہ، تم فکر نہ کرو۔"

میں اور محمودہ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ خاں صاحب، ڈیڈی جی، دونوں گواہان، ریز ... ان کے ہمراہ تھے۔ جب نکاح کی اولیں لکھت پڑھت ہوگئی تو میری اجازت لینے ڈیڈی جی اندر آئے۔ تین مرتبہ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا واقعی میں اس نکاح پر رضامند تھی؟ پھر میرے سائن کرائے۔ محمودہ ... جان کر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا اور شفقو کو اندر بھیج دیا۔ خاں صاحب نے اپنی پاس بک مجھے دے کر

"میں کوئی انگوٹھی وغیرہ نہیں لا یا...... بینک میں میرے نو سو روپے جمع ہیں، یہ تمہارے ہیں۔"

مبارک سلامت کا کوئی شور بلند نہ ہوا۔ میز پر ایک ڈبے میں مٹھائی اور ایک میں پانچ چھ پیسٹریاں پڑی تھیں۔ ... پھر دولہا پارٹی رخصت ہوگئی۔ محمودہ نے مزید باتیں کرنے کے بجائے چپ چاپ رخصت ہونے کو ترجیح دی اور ... سمیت غائب ہوگئی۔ ہم تینوں نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور خاموشی سے کھانا کھا کر سو رہے۔

اب ہم دونوں میاں بیوی تھے۔

دو دن کے بعد مجھے خاں صاحب نے کہا۔

"قدسیہ! یہ چوڑیاں اُتار دو۔ تم عموماً ایسی شوخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ کہیں اماں جی کو شک نہ ہو جائے۔"

میں نے کوئی حجت نہ کی۔ بس چپ چاپ چوڑیاں اتار کر زینب کو دے دیں۔

امی نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ سامان باندھ کر ملتان جانے کی تیاری کر لی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔

"قدسیہ! اب خوش ہو؟"

"جی بہت خوش۔"

"یاد رکھو اپنی مرضی کا فیصلہ عموماً مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرتے وقت نہ حوصلہ ہارنا ... سے شکایت کرنا۔"

اس سے زیادہ تبصرہ اُن کی ڈکشنری میں نہ تھا۔

امی کے جانے کے بعد خاں صاحب رات دیر گئے میرے پاس آتے، بڑی رازداری سے رات رہتے اور صبح ... ہو جاتے۔ میں نے اُن سے کبھی نہ پوچھا کہ ابھی کتنی دیر اور اس خبر کو صیغہ راز میں رکھنے کا ارادہ ہے۔ بہرکیف وہ ... مطمئن تھے اور میں اپنے طور پر بہت خوش تھی۔

ایک روز علی الصبح ڈیڈی جی آئے اور میری کھڑکی پر دستک دی۔

''شقو...... شقو۔ گھر چلو...... اماں اور پرتمہیں ملنے آ رہی ہیں۔ چلو فوراً''

خاں صاحب بستر سے چھلانگ لگا کر اترے۔ منہ ہاتھ دھو کر کے کپڑے پہنے۔

اور یہ جا وہ جا۔

چند دن نہ خاں صاحب آئے نہ ڈیڈی جی۔ 1- مزنگ روڈ میں بم کا گولا پھٹا۔

با با جی نے شقو کو تو کچھ نہ کہا، ڈیڈی جی سے بولے۔ ''مجھے پتہ ہے یہ ساری تیری کارستانی ہے۔ وہ کام میں تجھے مزہ ملتا ہے۔ شقو کی کیا مجال تھی کہ شادی کر لیتا۔ تو نے بدبخت اسے اُکسایا۔''

اس جرم کی پاداش میں ڈیڈی جی کو ''مزنگ نکالا'' برداشت کرنا پڑا۔ وہ دو ریڑھیوں پر سامان لا کر کے گھر پہنچے۔ آپی منیر اور بچے بے قصور تھے لیکن کیا کرتے۔ ساتھ ہی آتے بن پڑی۔ ماچھا جی نے ماتھے پر اور ڈیڈی جی کی زبانی انہیں پہلی بار پتہ چلا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔

آپی منیر خاں صاحب کی خالہ زاد بہن اور باجی ضیاء کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے کھوپن کی شکایت نہ کی۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں مشغول رہتیں۔ ایک شام البتہ انہوں نے مجھے حیران کر بچوں کو لے کر ہمارے گھر آ گئیں۔ ایک مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے طارق کو میری گود اُس کا منہ میٹھا کرنے کے بعد بولیں...... ''گود بھرائی کی رسم ہو گئی۔ آج سے یہ تمہارا متبنیٰ ہے۔''

اس رسم کی لاج ہمیشہ ڈاکٹر طارق بن افتخار نے رکھی۔ وہ نہ صرف شکاگو میں ایک عالمی شہرت کا سرجن ہے بلکہ اس کی بڑی ذاتی شناخت خاں صاحب کے حوالے سے ہے۔ اسے فوٹو گرافی اور ٹکٹیں جمع کر بہت شوق ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں خاص کر خاں صاحب کی کالے کرتے والی تصویر ان کی تمام کتابو ہے۔ ابھی جب باغ میں زلزلہ آیا تو وہ چند امریکی سینیٹروں کے ہمراہ پہنچا۔ ہم چونکہ ہر وقت امریکیوں کی محتاج ہیں اس لیے یہ بھی ایک ایسی شناخت ہے جو اہم ہے اور غالباً گگو (طارق) سے زیادہ ان سینیٹروں پر دی۔ وہ تو ہڈیاں جوڑتا رہا اور سینیٹر امریکہ کی شناخت میں اضافہ کرتے رہے۔

اماں جی اور با با جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا لیکن جب ڈیڈی جی مزنگ روڈ سے نکل آئے تو یہ ان کی مروت سے بعید تھا کہ وہ وہیں چوبارے پر ٹکے رہتے۔ انہوں نے اپنا سامان دو ریڑھیوں پر لادا۔ ٹوٹی والا نشانی وہیں چھت پر رہا اور وہ سمن آباد آ گئے۔ ویسے بھی اُن کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں ہی گزرتا تھا۔

ایک روز دو ریڑھے ہمارے گھر کے آگے رُکے۔ اُن میں زیادہ تر خاں صاحب کی کتابیں اور الماریاں تھیں۔ اب وہ لمبا کمرہ جو ہمارا ڈرائنگ روم کم ڈائننگ روم تھا، اس کی لمبی دیوار کے ساتھ کتابوں کی الم گئیں اور گول میز پر بیٹھ کر خاں صاحب مطالعے میں غرق رہنے لگے۔

نکاح کے بعد باقاعدگی سے گھر آنے والے جناب محمد حسین سٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان اور ریکارڈسٹ ریڈیو پاکستان تھے۔ خاں صاحب ان سے باتیں کم ہی کرتے۔ نانا نے ان سے دوستی کر لی اور

ے میں بیٹھ کر تاش پر رمی یا بینک بینک کھیلتے۔ کبھی کبھی جب ڈیڈی جی آ جاتے تو ان کو چوتھا پارٹنر مل جاتا۔ عموماً مجھے بھی کھیلنے پر اُکساتے لیکن پتہ نہیں کیوں میں زیادہ وقت نہ نکال سکتی۔

دنوں ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

فرحت سمن آباد میں آ چکی تھیں۔ جاوید اپنی پڑھائی سے بہت غافل تھا۔ اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو اس نے اپنے کلاس کے چند ناکارہ لڑکوں سے دوستی گانٹھ لی تھی اور ان کو اپنی جادو بیانی سے مطیع کر رکھا تھا۔

سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ جب میں 450-این میں خالہ کے پاس رہتی تھی۔

ایک روز آپا جی فرحت میرے پاس آئیں اور کہا...... ''قدسیہ! تم نے ناہید جیسی بے پروا کھلنڈری کو بی۔ اے جیدی مجھے بی۔ اے کرتا نظر نہیں آتا۔ کچھ اس کی مدد کرو۔'' ہمیشہ کی طرح میں نے کام کی نوعیت سمجھے بغیر حامی

جاوید پڑھنے کے لیے آنے لگا۔ پڑھائی تو مشکل نہ تھی لیکن جاوید اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پپی لے آتا۔ سارا میں پڑھاتی وہ اس کتے کو گود میں رکھ کر کبھی سہلاتا، کبھی گدگدیاں کرتا، کبھی غراتا...... اس مشغلے کے ساتھ پڑھنا گیا۔ ایک روز میں نے جاوید سے کہا۔ ''جیدی! تم کل سے کتا نہیں لاؤ گے۔ اگر کتا لانا ہے تو گھر بیٹھو۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ جیدی نے گھر آنا چھوڑ دیا۔

ایک روز آپا جی آئیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ ''قدسیہ! امتحان میں کم وقت رہ گیا ہے۔ جیدی آنے پر رضامند نہیں ہے کہ تم ہمارے گھر آ کر پڑھا جایا کرو؟''

اب میں باقاعدگی کے ساتھ آپا جی کے گھر جانے لگی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ایک صاف ستھری خانہ دار قریب سے دیکھا۔ آپا جی کے شوہر نامدار بھائی عبدالقادر سی وال میں ہی تھے اور آپا جی جاوید کی خاطر یہاں تھیں۔ ساتھ والے گھر میں آفتاب بھائی رہتے تھے۔ ان کے گھر چونکہ بیوی نہ تھی۔ خالد آفتاب اور وہ آپا جی کھاتے اور خالد سکول کے بعد اپنے کتے Lassi کے ساتھ سڑکیں ناپتا تھا۔

آپا جی کے گھر کے قریب چوہدری برکت علی کی کوٹھی تھی۔ اس زمانے میں ان کا رسالہ ''ادبِ لطیف'' اپنا مقام میں بنا چکا تھا اور ان کے اعزہ رشید احمد چوہدری وغیرہ کے مکتبہ جدید سے خاں صاحب کی کتاب ''ایک محبت حبیب چکی تھی۔ ریزی ان کے سرورق بنانے کے لیے مکتبہ جدید جایا کرتا۔ چوہدری برکت علی فوت ہو گئے تو سے اتنا بڑا کاروبار سنبھل نہ سکا لیکن چوہدری صاحب کی بیٹی گو اس وقت محض سولہ برس کی تھی، اس نے ہوش دیا۔ بہت زیادہ پڑھنے والی صدیقہ ذہانت کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے دل کی مالکہ تھی۔ جاوید پھر نے زندگی سے حظ اٹھانے کی عمر میں تھا۔ بسوں پر آتے جاتے، بس سٹاپ پر انتظار کے دوران دونوں کی گئی۔ جاوید کی عمر اس وقت بمشکل تمام اُنیس برس کی تھی۔

اچانک پتہ چلا کہ جاوید نے بھی پٹھان برادری کی روایت چکنا چور کر دی۔ اس نے ایک غیر پٹھان سے نکاح کر لیا اور آپا جی نے خاندان کی پاسداری میں جیدی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بوریا بستر لے کر

ہمارے گھر آ بسا۔

بظاہر یہ سارے کوائف اس بات کی دلیل تھے کہ جاوید ناکارہ، ناکام اور زندگی میں کسی مقام پر پہنچ تھا لیکن زندگی کا کچھ علم نہیں۔ آج وہ ہائی نون لیبارٹریز کا مالک ہے جو ایشیا کی ایک بہت بڑی ادویات بنانے ہے۔ کوئی شخص کن وجوہات سے کہاں پہنچتا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

یہاں کچھ لمحے توقف کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ اپنے تجربات سے اخذ کیا ہوا کچھ مشاہدہ Share ک ہوں۔ باری تعالیٰ ہمیشہ نیکی سے نیکی کے نتائج اخذ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ نیک اعمال کے نتیجے میں برے حالات لاتا ہے اور کبھی کبھی برائی بھی بڑی کارآمد شاندار مستقبل کی ضامن بن جاتی ہے۔

آج 2007ء ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ''مختاراں مائی'' نے کس عروج کو چھو لیا ہے۔ وہ Rape پتہ نہیں کیوں اور کیسے پہلے پاکستانی میڈیا نے اور پھر یورپی اور امریکی الیکٹرونک اور پریس میڈیا نے اُسے آ دیا حتیٰ کہ وہ یواین او کی مہمان بن گئی اور شہرت کا وہ مقام پا لیا جو محنت اور مثبت کاموں سے نکل نہ سکتا تھا۔

ہزاروں نہیں لاکھوں ایسی لڑکیاں ہیں جن سے اغوا اور جنسی تشدد کا واقعہ پیش آیا۔ تمام عمر ذلت احساسِ کمتری کا شکار رہتی ہیں لیکن وہ بے نیاز، قادرِ مطلق کسی کے مشورے کا محتاج نہیں نہ روادار ہی۔ وہ یہ دکھ ہے کہ برائی سے بھی نیکی کے نتائج نکال سکتا ہے اور کئی بار ساری عمر کے نیک اعمال، عبادتیں بھی منفی نتائج نکال ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان نیک اعمال سے منہ موڑ لے اور یہ سمجھنے لگے کہ اگر میں نتیجے پر قابض نہیں مشقت سے حاصل! بات وہیں آ کر رکتی ہے کہ مالی کا کام پانی دینا ہے۔ پھل پھول لگانے والا کہیں اُوپر چاہے نہ چاہے اس بے نیاز کی مرضی۔ کسی کی محنت کو قبول نہیں کرتا اور کسی کی نااہلی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

455-این، سمن آباد کا گھر ہمارے لیے عجیب بابرکت ثابت ہوا۔ خاں صاحب اور میں دونوں مال دکھانے کے مرتکب ہوئے لیکن عجیب بات اس کا نتیجہ ہمارے لیے مثبت ملا۔ ہم دونوں ایک ہی دھکے میں اور تقویت سے پُر اپنی صلاحیت، قابلیت اور اہلیت کے متلاشی ہو گئے۔ یہاں ہی سے ''داستان گو'' رسالہ نکالا غالباً برصغیر میں پہلا اور اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا۔ ریزی کی بیکاری بھی خوب کام آئی۔ اس نے کچھ دیر صرف کی اور پھر ایک روز خاں صاحب رسالے کی ڈمی بنانے میں مشغول تھے کہ ریزی اُن کے پاس آیا۔

''یار شفو! میں ''داستان گو'' کا ایسا سرورق بنواؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے سلک سکرین پرنٹنگ (Silk screen printing) کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ میں وہ جالی لوں گا جس پر جو بھی تصویر بنانا ہوگی بنا لوں گا۔ پھر ہم رنگ اوپر ڈال کر سکوجی پھیریں گے نقش نیچے کاغذ پر آ جائے

''یار یہ سکوجی کیا بلا ہے؟''

''جس طرح شیشوں کو صاف کرنے کے لیے ایک وائپر نہیں ہوتا، فرشوں پر پھیرنے والا وائپر؟''

''یار احمق نہ بنو ریزی۔ ابھی مغرب میں اس کی تحقیق تصدیق کو نہیں پہنچی۔ تم کہاں سے اتنے تیس مار خاں

"ہاں ہاں۔ جو مرضی مجھے کہہ لو۔ میں کر کے دکھاؤں گا۔ ایک مشکل ہے۔ جتنے رنگوں کا ٹائٹل ہوگا۔ اتنی مرتبہ ہر رنگ کا نا ہوگا جیسے لباس سفید، دوپٹہ گرین، قالین سرخ ہوا تو تین بار سرورق چھاپنا ہوگا۔"

"بھائی اتنے سارے کاغذ سکھائیں گے کیسے۔ باہر تو سکھانے کے لیے مشین ہوتی ہے۔" خاں صاحب بولے۔

"میں نے اُس کا علاج بھی تلاش کر لیا ہے۔"

"کیا؟ مسٹر واس کو ڈی گاما۔"

"ہمارے برآمدے میں جو چقیں لگی ہیں، ان کے کونوں میں جو خالی جگہ ہے وہاں سوکھنے کے لیے آرام سے ٹک جائیں گے۔"

"دیکھیں کہیں مروا نہ دیں۔ پہلے ہی خرچہ نہیں چلتا۔"

میں جو یونہی بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ میرا کام بھی متعین ہو گیا۔ میں ایک ایک کاغذ اٹھاتی اور اسے چق میں پھنسا کے لیے لگا دیتی۔ خاں صاحب نے رسالے سے پہلے مال روڈ پر دفتر "داستان گو" بنا لیا تھا۔ سلیم چوہدری یہاں ہوتے۔ ان کے علاوہ کاتب یوسف رسالے کے میٹریل کی کتابت کرتے تھے۔ اُن دنوں ابھی کمپیوٹر ایجاد نہ ہوئے تھے اور خطاطی کا فن ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کاتب یوسف نے نہ کبھی اجرت مانگی نہ کبھی کسی قسم کا تقاضا ہی کیا۔ کام ملا تو کتابت کر لی نہ ملا تو دفتر میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ سلیم چوہدری محکمہ فوڈ میں ملازم تھے۔ وہ بھی کسی قسم کی تنخواہ یا کسی خاطر نہ آتے۔ جب رسالہ چل نکلا اور دفتر میں لوگ آنے لگے تو اُن کا خیال کرتے، چائے پانی پیش کرتے۔ صاحب آ جاتے تو پچھلی سیٹ اختیار کر لیتے۔

مجھے کبھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ میں گھر پر ہی بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ محمد علی رقعہ لے کر میرے پاس آتے۔ خاں صاحب عموماً "داستان گو" کی چھپی ہوئی پرچی پر لکھتے۔ "قدسیہ! یوسف خالی بیٹھا ہے، میٹریل نہیں ہے۔ کوئی مضمون؟ فوراً لکھ کر بھیجو۔"

تمام کام پس پشت ڈال کر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتی۔ رسالے میں اپنے پُراعتماد لوگوں کے نام سے کہانیاں، لکھ کر بھیج دیتی۔ جیدی، صدیقہ، ڈیڈی جی کے نام سے کئی کہانیاں لکھیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز ڈیڈی میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "کاکی! یہ تت کی آنکھ کیا چیز ہے؟"

"ڈیڈی جی! یہ مصر کے فرعون تت آخ موں کے نام سے مخفف بنایا۔"

"منّی! مجھے تو بتا دیا ہوتا۔ آج دفتر میں ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ کچھ معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔"

میں کچھ پریشان ہو گئی تو ڈیڈی جی بولے۔ "چل میں نے سنبھال لیا تھا تو ایویں فکر نہ کر۔"

عموماً ڈیڈی جی میری اور صدیقہ کی غلطیوں کو اسی طرح سنبھالنے کے عادی تھے۔ یہ جھوٹ کی وہ قسم ہے جو کسی کی دلداری کو بچانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ڈیڈی جی سری پائے اٹھا کر لے آئے۔ میں نے کبھی نہاری، سری پائے، شامی کباب وغیرہ نہ بنائے۔ مجھے ڈیڈی جی بولے۔ "یہ منّی! تیرے سپرد لیکن زینب سے نہ پکوانا خود پکانا۔"

وہ تو سودا پکڑا کر چلے گئے۔ میں ایک امتحان میں پڑ گئی۔ رات جب وہ اور ڈیڈی جی کھانے بیٹھے تو ڈیڈی جی

نے بڑے چسکے لے کر کھائے۔ میں سمجھی یہ پھر ڈیڈی جی میرا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اُن کے
بعد میں نے تعریف طلب نظروں سے خاں صاحب کو دیکھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر بولے۔ ''واقعی قدسیہ! تم نے
کی طرح پائے پکا دیئے۔''

پھر انہوں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور اس پر سائن کر کے مجھے دے دیا۔ اُن کی داد دینے کا
انوکھا طریقہ تھا۔ وہ ایک روپے کے نوٹ پر آٹوگراف کر کے تعریف کیا کرتے تھے۔

کچھ دیر تو ڈیڈی جی اپنی کائی ماں کے پاس رہے لیکن پھر غیرت مند آپی جی نے گھر تلاش کر لیا اور
کالونی بوریا بستر سمیٹ کر چلے گئے۔ میرا اور خاں صاحب کا معمول تھا کہ ہم شام کے وقت ڈیڈی جی کے گھر چلے
یہ ہمارے لیے بہت خوشی اور آنند کی تقریب ہوتی۔ خاں صاحب اپنے گھر سے زیادہ ڈیڈی جی اور آپی منیر کے گھر
Home محسوس کرتے۔ فرش پر چھوٹا سا میز پوش بچھا کر آپی جی، ڈیڈی جی اُن کے بچے لبنیٰ، ککو، حارث
دسترخوان کے مزے لوٹتے۔ میں آپی جی سے پکانے کے گُر اور ترکیبیں سیکھتی۔ ڈیڈی اور خاں صاحب 1-مزے
باتیں کیا کرتے۔

جب کبھی خاں صاحب شہر سے باہر جاتے، میں آپی جی کے پاس رات گزارتی اور لبنیٰ میرے پاس سوتی
خاں صاحب کے گھر میں رواج تھا کہ عام طور پر چھوٹے ہی بڑوں کے گھروں سلام کرنے جاتے اور
شاذ ہی چھوٹوں کے گھر پھیرے اڑاتے۔ جس طرح ہمیں ڈیڈی جی کے گھر جانے کی عادت تھی ویسے ہی صدیقہ
قریباً ہر دوسرے تیسرے روز ہماری طرف آ جاتے۔

دن گزرتے گئے اور ہم بغیر شور مچائے ترقی کرتے چلے گئے۔

پھر وہ دن آ پہنچا۔ جب اللہ کو ہمارے گھر ایک نئی روح بھیجنا تھا۔ مجھے دیکھنے اور میرے حالات
لیے ایک معمولی سی دائی حسین بی بی آیا کرتی تھی۔ دبلی پتلی دراز قد بڑی خاموش طبع۔ وہ چرب زبانی سے کم اور
آنکھوں سے کام لینے والی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتی اور مجھے دبانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ میں
کبھی اس آسائش کو اپنے لیے جائز نہ سمجھا۔

جس روز انیق بیٹے کو دنیا میں آنا تھا۔ میری تکلیف کے تیور دیکھ کر امی نے مجھے خالہ کے گھر 450-این
ہونے کے لیے کہا۔ انہوں نے چھوٹے بچے کے لیے اپنے ہاتھ سے آٹھ جوڑے سی رکھے تھے۔ ان کی پوٹلی بنا
چابچی اٹھائی اور ہم دونوں نے ماچھا جی کے جا کر دستک دی۔ گویا دونوں بہنوں میں اس تقریب کے لیے پہلے سے
ہو چکی تھی۔

فوراً حسین بی بی کو بلوا لیا گیا۔ پتہ نہیں ڈیڈی جی کو کیسے خبر ہو گئی۔ وہ واقعی میرے باپ کا رول ادا کرنے
آ گئے۔ انہوں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر پورا وقت
یٰسین پڑھتے رہے۔

جس وقت نوکی نے پہلی اضطرابی چیخ ماری، جمعے کی اذان ہو رہی تھی۔ ڈیڈی جی نے شکرانے کے دو نفل پڑھے

حسین بی بی نے نہایت خاموشی سے بچے کو نہلایا دُھلایا، صاف چادر میں کس کے باندھا اور ڈیڈی جی کے بازوؤں میں دے دیا۔ ڈیڈی جی نے انیق بیٹے کے کان میں اذان دی اور بڑی خاموشی سے اُسے خاں صاحب کی گود میں دے دیا۔

18 اکتوبر 1957ء میں انیق اس دنیا میں آئے۔

اور پورے سال بعد 16 ستمبر 1958ء کو انیس بیٹے نے ہمارے گھر کو روشنی بخشی۔ نانا تو گھر پر موجود تھیں لیکن امی کی تبدیلی شیخوپورہ ہو چکی تھی اور وہ لاہور میں نہ تھیں۔ ڈیڈی جی بھی کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس بار اُن کا سہارا تھا۔ خاں صاحب نے باہر والے برآمدے میں اپنی چارپائی بچھوائی۔ اندر نانا اور حسین بی بی اپنی کارروائی اور میں اپنی جگہ تنہا ہو گئی۔ قریباً دو بجے کے قریب انیس بیٹے نے چیخ مار کر اپنی آمد کا ڈنکا بجایا۔ حسین بی بی نے اسے نہلا دُھلا کر کس کر باندھ کر امی جی کو دیا تو وہ بولیں ..... ''ہائے بچارے کو اتنی سختی سے کیوں باندھ دیا ہے؟''

''بی بی جی! اس طرح بچہ ڈرتا نہیں اور روتا بھی کم ہے۔''

اس سے زیادہ حسین بی بی نے کوئی توجیہہ نہ دی۔ امی نے خاں صاحب کو بچہ دیتے وقت بہت ہولے سے کہا ہوگی۔ تالیاں بجا کر چیخیں مار کر خوشی کا اظہار کرنے والی نانا پریشان تھیں کہ اوپر تلے کے بچے کیسے پالے جائیں گے۔ بیٹی اتنی سادہ لوح اور غیر Practical ہے کہ یہ اتنی ذمہ داری کیسے اٹھائے گی۔ وہ خود تو ملتان جاتی رہتی تھیں اس لیے اس کام میں ہاتھ بٹانا ممکن نہ تھا۔

لیکن ہم دونوں کو علم نہ تھا کہ بچے تو آفرینش کا مسئلہ ہے۔ پرورش تو اوپر والے کی صفت ہے۔ وہ فقط ماں کے سر کے لیے اس کارِ خیر میں اسے شامل کر لیتا ہے اور اس کی جزا بھی مقرر کر دی ہے۔

اس معاملے میں خاں صاحب نے میری بہت مدد کی۔ چھوٹا سا انیق جب گجر دم اٹھتا اور دودھ کے لیے ضد کرتا تو خاں صاحب اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے اور سڑک پر ٹہلاتے۔ اتنی دیر میں دودھ کی بوتل تیار ہو جاتی اور یوں بچے کو رونے سے بچا لیا جاتا۔ میری خوراک اور صحت ایسی نہ رہی تھی کہ میں انیق کو اپنا دودھ پلاتی۔ تین چار مہینے کے بعد اسے بوتل پر لگانا پڑا۔

انیس کی پرورش میں اس قدر مشکل بھی پیش نہ آئی۔ ایک تو وہ اپنی Genetics کے اعتبار سے رونے دھونے والا اور مچانے والا نہ تھا۔ پھر مجھے بھی بچہ پالنے کی انگل آ چکی تھی۔ بڑے آرام سے وقت گزرتا گیا۔ حسین بی بی انیق کے پوتڑے دھونے آتی تھی۔ پھر انیس کی جوگان دھو جاتی۔ اس سے زیادہ وہ ہمکلامی کی عادی نہ تھی۔

میرے تیسرے بیٹے اثیر احمد کی پیدائش 15 جون 1962ء میں ہوئی۔ اب تک ہماری زندگی میں مالی سہولت آ گئی تھی۔ جاوید کے پاس ایک ہری موریس گاڑی تھی اور وہ بینک میں اچھی خاصی تنخواہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے ثویلہ کی پیدائش کے وقت ہمیں ایف سی کالج کے ہسپتال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ہم ڈاکٹر مارٹن جسے ہم لیڈی مارٹن کہتے تھے، واقفیت رکھتے تھے۔

اثیر کی پیدائش کے وقت ہم نے حسین بی بی سے رابطہ نہ کیا۔ انسانی فطرت کے مطابق ہم اس کی خدمات کو بھول گئے۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ انیق کی باری تو میرا فلیبوٹ کی بہن جیوا نندن بروقت آ گئی تھیں اور انہوں نے دس

ٹانکے بغیر بے ہوش کیے لگا دیے تھے لیکن اب صرف خوف ہی تھا، انتظام نہ تھا۔

جاوید ایک دن گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے اور خاں صاحب کو لے کر ایف سی کالج کے کرسچین ہسپتال م

"معائنہ کرانے میں کوئی حرج نہیں ماموں۔ اگر معاملہ ٹھیک ہوا تو مامی کو واپس لے آئیں گے۔"

جب میں ہسپتال پہنچی تو ڈاکٹر مارٹن ان دونوں کو باہر چھوڑ کر مجھے ڈلیوری روم میں لے گئی۔ مجھے لیٹنے

کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد اُس نے مجھے تعجب سے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ تیرا دسواں مہینہ ہے اور اگر ابھی بچہ کی ڈلیوری نہ کی گئی تو اس کی جان کا خط

اس کے بعد اس نے مجھے جلدی سے اوپر تلے ٹیکے لگائے۔ بے ہوش رکھنے کا جتن کیا اور اثیر میاں بڑی مشکل کے پہلے پہر اس دنیا میں آ گئے۔ اس طرح ہماری دنیا کو منور کرنے تین چاند ہماری خوش قسمتی کا مظہر بن گئے۔

یہاں کچھ اور بچوں کی آمد کا حوالہ دینے پر طبیعت آمادہ ہو رہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے پیدائش کا باب ممنوع تھا لیکن اب 2007ء میں بچہ منہ میں انگلی ڈالنے کا نہیں اور صحت کے ضمن میں اس کی اہ جنسی تعلیم بچوں کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہے۔

ڈیڈی جی ان دنوں چوہدری کالونی میں رہتے تھے۔ انیق کی پیدائش سے ٹھیک دس دن بعد ڈیڈی جی کی اس دنیا میں تشریف لائی۔ ابھی حسین بی بی کا سکہ چلتا تھا۔ میں نے اور خاں صاحب نے بھاگم بھاگ ڈیڈی جی کے گ خاں صاحب نے اس کے کانوں میں اذان دی۔ اس طرح بابا محمد خاں کے گھنے درخت میں ایک اور میٹھا پھل لگا۔

صدیقہ بیگم دمے کی مریضہ تھی۔ کبھی کبھی جب اسے اٹیک ہوتا تو اس کا دم اکھڑ جاتا اور لگتا آخر ہے۔ میں نے ایک دن صدیقہ کو مشورہ دیا کہ ایف سی کالج ہسپتال چلتے ہیں۔ تم اپنا معائنہ کراؤ۔ یہ کام حسین بس کا نہیں لگتا۔

"لیکن مامی جائیں گے کیسے۔ گاڑی وغیرہ تو ہے نہیں۔ آپ کے بچے چھوٹے ہیں۔"

احمقوں کی طرح میں نے کہا۔ "بس میں چلیں گے۔ نہر کنارے تک بس لے جائے گی۔"

"اور اُس سے آگے۔"

"تھوڑا راستہ ہے تو کوئی چل لے گا۔ لالے کو میں اٹھا لوں گی۔"

"دیکھ لیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف وکلیف نہیں ہوتی۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔"

تب امن آباد سے نہر کے آخری سٹاپ تک ایک آدمی کی ٹکٹ دو روپے تھی۔

ہم دونوں مع بچگان ہسپتال پہنچے۔ یہاں اس وقت معائنے کی غرض سے عورتیں جمع تھیں اور باری باری مارٹن سے مشورہ کرنے کے لیے اندر جا رہی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح میں ڈاکٹر مارٹن کا نام سن کر بڑی مرعوب ہوئی۔ سفید قوم کے گورے پن کی ہیبت کے سامنے نے تمام ہتھیار ڈال دیے۔ اندر ڈاکٹر مارٹن کے پاس پہنچ کر میں نے قدرے دلیرانہ انداز اختیار کیا اور اسے صورتح

[illegible] نے کچھ پڑتا لگا کر مجھے ایک چٹ دی جس پر وقت، تاریخ درج تھی اور لکھا تھا کہ پیدائش کے وقت میں [illegible] ہسپتال پہنچ جاؤں۔ حسنِ اتفاق سے نانا آ گئیں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جانا پڑا۔ جس وقت ہم ہسپتال [illegible] ڈاکٹر نے پڑتے ہی صدیقہ بیگم کو اندر ڈلیوری روم میں بھیجنے کا حکم دیا۔

جاویداور خاں صاحب مع میرے باہر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد لیڈی مارٹن باہر آئی اور مجھے ایک گاؤن پکڑا کر بولی "یہ کپڑے کا ماسک اور گاؤن پہن کر [illegible] آؤ۔ مریضہ کی حالت ٹھیک نہیں۔"

خاں صاحب نے جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ میں گاؤن اور ماسک چڑھا [illegible] بھاگ اندر پہنچی۔ صدیقہ قریب قریب بے سدھ تھی۔ پھر لیڈی مارٹن کی تگ و دو سے گھنٹے کے بعد ثویلہ اس دنیا میں [illegible] Under-weight تھی۔ مشکل سے چھ پاؤنڈ کی ہوگی۔ بچی کو نہلا دھلا کر باہر لائے تو لیڈی مارٹن نے مجھے [illegible] دکھائی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سفید پلاسٹک کے منکوں کا ایک بار سا اس کی کلائی میں پڑا تھا اور اس پر ثویلہ کا [illegible] جاوید لکھا تھا۔

مجھے بچی سونپتے ہوئے ڈاکٹر مارٹن نے کہا "دیکھو، ماں کے زندہ رہنے کی امید کم ہے۔ تم قسم کھاؤ کہ تم بچی پال لوگی؟"

"میں..... لیکن میرے اپنے دو بچے ہیں۔ میں کیسے؟"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بچی تنہائی محسوس نہیں کرے۔ قسم کھاؤ اپنی ہولی بک کی کہ تم بچی کو دغا نہیں دوگی۔"

ہمیشہ کی طرح میں نے حامی بھر لی۔

عجیب بات ہے اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتا۔ میں تو اپنی کمزوری سے آگاہ نہیں تھی لیکن ثویلہ کی [illegible] نے صدیقہ کو صحت دے دی۔ پھر جاوید نے صدیقہ کا بڑا ساتھ دیا اور دونوں نے دو ہاتھ بن کر ثویلہ کو پال نکالا۔

جب اثیر کچھ سال بعد اس دنیا میں آیا تو ثویلہ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہوا اور ہم بروقت ہسپتال جا پہنچے۔ جب [illegible] کے بعد مجھے کچھ دن ہسپتال میں رہنا پڑا تو میرے پاس آپی منیرآ کر رہتی تھیں۔ وہ نو دس بجے ممن آباد سے بس [illegible] ۔ اپنا کھانا ساتھ لاتیں اور شام کو میری سیوا، دیکھ ریکھ کرنے کے بعد گھر لوٹ جاتیں۔ اس غیرت مند خاتون نے [illegible] کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایسے لوگوں سے سیکھنے کا موقع ملا۔

ماموں کی باتیں (ریزی کی باتیں)

اس تحریر کو لکھتے ہوئے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میرے ماموں اصل میں ایسے ہی انسان تھے۔ اس کتاب میں [illegible] گئے ہوئے افراد من گھڑت اور مصنوعی ہیں اور میرا کسی پر کیچڑ اچھالنا اور کسی کے دامن پر داغ دھبہ لگانے کی منشا نہیں۔ میں اس کہانی میں آپ کی تفریح کا سامان مہیا کروں گا لیکن آپ کی بدمزاجی کے پیش نظر بچوں اور بیویوں کی سینڈلوں سے [illegible] وہ آپ کو میری یہ تحریر فرسودہ اور فضول لگے گی۔

میری التماس ہے کہ اس کا پہلا باب پڑھ لیجیے اور اگر ممکن ہو تو پورا پڑھ لیجیے۔ اس کتاب کو خریدنے کی ضرورت

نہیں کیونکہ اس وقت جو کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہم نے ایڈیٹنگ کے لیے بنائی تھی لیکن ایک کلرک کی نا
باعث دوسری کتابوں میں اسے ملا دیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب بک سٹال پر پہنچ گئی۔ دوسرے آپ کی ذہانت کو دیکھ
تعجب ہو رہا ہے کہ آپ نے اپنے قیمتی سرمائے میں سے اسے خرید لیا ہے جو درحقیقت Pre-editing کی کاپی ہے۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ بھلا دوپہر کا ذکر تو نہیں ہو رہا۔ میری گال پر کسی نے ہلکی سی چپت لگائی جس کی و
میں ڈرنے کے بجائے مایوسی کے عالم میں چلا گیا کیونکہ جب آنکھیں کھولیں، سامنے ماموں کا چہرہ نظر آیا۔ دل ہی د
خیال آیا کہ آج کا دن بھی مایوسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ویسے تو ماموں کے ساتھ ہماری بے تکلفی اور دوستی بہت گہری تھی لیکن خواب میں امریکی صدر کے الیکشن
مرحلہ درپیش تھا، جہاں ذاتی سکینڈل اور Perjury جیسے واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً آپ میری تحریر سے واق
چکے ہوں گے کہ چوبیس سالہ دوشیزہ مانیکا لیونسکی کے تعلق سے صرف دو تین سالوں کے قصے پر تھا اور یکدم اٹھ
باعث ایک کالا گھیرا نما ابھرا جس کے چند داڑھی کے بالوں سے مشابہت ہو، مجھے نظر آیا۔ آنکھیں ملنے پر تصویر
صاف ہوئی تو یہ ہمارے ماموں تھے۔

یہ بات ابھی تک میرے لیے معیوب اور معنی خیز ہے کہ ہمارے نانا سرخ وسفید چھ فٹے باہمت آدمی تھے
شادی پنجاب کی ایسی دوشیزاؤں میں سے ایک سے ہوئی جن کا تعلق بٹ خاندان سے تھا مگر چاند گرہن کے باعث
ماموں کی رنگت کچھ ایسی تھی کہ رات کو ہنستے وقت ان کو شاذا جنوبا پہچاننا صرف دانتوں کے باعث ہوا کرتا۔

شاید ایسی صورت میں گھر والوں کی توجہ اپنے بیٹے پر کم تھی، جس کی بنا پر ماموں کی تعلیم و تربیت کچھ زیادہ
ہو پائی۔ آپ آٹھ کے پہاڑے سے زیادہ نہ جانتے تھے اور املا کو عاملا لکھا کرتے تھے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں ما
ذہن چست اور جملے کی ادائیگی میں تیز طرار تھا۔ میرے مشاہدے میں ایسا کوئی وقت نہ آیا جب ماموں نے حاضر
سے کام نہ لیا ہو۔ آپ کی شہرت اور مشہوری بام عروج پر تھی۔ آپ کو معززین میں سے سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ داڑھی
منڈوانے والے کو زبردستی اُٹھا کر ماموں کی کرسی پیش کرتا۔ اس اُٹھک بیٹھک میں نہ صرف دوکان ہی میں ہنگامہ
بلکہ کئی دفعہ متعدد اُستروں کے وار خالی جانے کی بنا پر اور ماموں کی جان مشکل سے بچتی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے
بازار میں سائیکل مستری، کلچہ فروش، پرچون والا اور دیگر دوکانداروں سے ماموں کا باضابطہ رویہ کیسا تھا۔

سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ چند مشکل اوقات بازار کا ادھار ماموں پر لگ بھگ پندرہ ہزار تھا لیکن ان
کریڈٹ کی لائن کسی IMF کی محتاج نہ تھی۔ رہا Debt Servicing کا معاملہ تو صرف شخصی Collateral کی بنا پر ا
Multiple Revolving Finance کا چکر تھا۔ کبھی تو گوشت والے سے پیسے لے کر سائیکل والے کو پکڑا دیے
سائیکل والے سے لے کر نانبائی کو دے دیے جاتے لیکن اس سے اپنی کمیشن جھاڑنا نہ بھولتے۔ اس کریڈٹ کے چلتے پ
سے سارا بازار خوش اور مطمئن تھا لیکن اس محاورے سے بازار ناواقف تھا کہ احمد کی پگڑی محمود کے سر اس خوش اسلوبی سے
پہنائی جاتی ہے کہ احمد بھی دلفریب رہتا ہے اور محمود تو دلکش ہی ہوتا ہے کیونکہ پگڑی بار بار اس کے سر پر آ جاتی ہے۔

479-این، سمن آباد

455-این سے 479-این سمن آباد میں نقل مکانی کسی بڑی شبھ گھڑی ہوئی، کیونکہ اس مکان میں منتقل ہوتے ...داری اور غریبی سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ زندگی میں خصوصی مشکلات جو در پیش رہتی ہیں ان میں غریبی، بے ...سرالی جھگڑے، ساس نندوں سے اڑچیں، بے روزگاری، اولاد کی آزمائش، بیماری، موت جیسی تکلیفیں کس وقت کیسے ...یں، ان کا قیام کس قدر لمبا ہوتا ہے یہ انسانوں کی اپنی Genetics، ان کے فیصلے اور ان کے ماحول سے نبرد آزما ...کی قوت پر منحصر ہے۔ جو کچھ مجھے سمجھ آئی وہ یوں ہے۔

جب بھی کسی شخص کو غریبی سے پالا پڑتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے راستے کسی نہ کسی طور پر بند گلی میں جا پہنچتے ...بالکل معمولی ضرورتیں، ادھوری خواہشیں، نا آسودہ احساس کمتری کی فضا، خود اعتمادی اور بے مائیگی کی فضا ہر لحظہ قائم ...ہے۔ کچھ لوگ غریبی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رشتہ داروں سے جڑے رہتے ہیں اور اپنے حالات کی ...کو مانگے کی شفقتوں سے سینچتے رہتے ہیں۔ لیکن جونہی حالات بہتر ہوجاتے ہیں، وہ رشتے ناطے جو ذاتی ضرورت ...ت اہم تھے غیر اہم ہونے لگتے ہیں جیسے کوئی ستارہ اپنے مدار سے نکل جائے اور واپس نہ لوٹ سکے۔

غریبی میں بنائے گئے روابط ساری عمر فٹ نہیں آتے۔ یہ یا تو کھلے ہوتے ہیں یا بہت تنگ..... دراصل غریبی ...ف کام ہی ہتھیار بن سکتا ہے۔ غریبی میں صبر عموماً مجبوری کا نام ہے۔ حسرتوں کے چوکھٹے میں اس عہد کی تصویر ٹانگی ...تی ہے۔ یوں سمجھیے کہ غریبی میں انسان اپنی اس کمزوری کے ہاتھوں مجبور، رنجور اور منہ اٹھائے آسمان کو تکتا رہتا ہے کہ ...حالات بدلیں۔ کب وہ ڈیپ فریزر میں جمے گوشت کی صورت باہر نکلے..... نہ بو باس نہ ذائقہ..... بس گوشت ہی ...شت۔ وہ بھی مجبوری میں صبر کی طرح ٹھنڈا اور جما ہوا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس امیری کچھ کم امتحان نہیں۔ امیری عجب تیزاب کا مٹکا ہے۔ اس میں آسائشیں، زیبائشیں، اسراف، ...ی، کام چوری بہت کچھ آدمی کو اپنے میں گھولنے لگتی ہے۔ وہ اس تیزاب کے مٹکے میں یوں حل ہونے لگتا ہے جیسے ...ڈھیلا ہولے ہولے پانی میں حل ہوتا رہے.....